استشراق اور بیانیوں کا حصار

ڈاکٹر سہیل ممتاز خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ (اردو)
گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ، لاہور

Abstract
In the given article, an effort was made to elaborate Orientalism with its past and present spectrum. For this, renowned Orientalists and their work is briefly discussed; particularly foci on British, French and German orientalism and their endeavours. Some important of them, like William Jones, Louis Massignon and DR. Annemarie Schimmel were discussed, explicitly. This very discourse applied for multiple, good or vested interests; as from Biblical search to State expansionism or colonization it was envisaged and different opinions are in vogue to grab attention of Scholars-cum-readers. We chose reliable sources to have a good conclusion. This case study is very much attached with Urdu language and literature.

Key Words:
استشراق(Orientalism)، برطانوی ہند(British India)، نوآبادی(Colonization)، جرمن استشراق(German Orientalism)،اردو ادب(Urdu literature)ایڈورڈ سعید (Edward Said)،ولیم جونس(William Jones)،

لفظ 'استِشراق' استِفعال کے وزن پر ہے اور اس کا مادہ 'شرق' ہے جو مشرق، پورب کے معنٰی میں مستعمل ہے اور انگریزی زبان میں اس کے لیے The East or Orient(۱) ایسے الفاظ، استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح استشراق کے لیے 'Orientalism' اور مستشرق کے لیے 'Orientalist' ایسے الفاظ مروج ہیں۔ لفظ 'شرق' کا اطلاق اور اس کی جغرافیائی تفہیم کی بابت ذیل کی دو آراء اہم ہیں(۲):

"قرونِ وسطیٰ بلکہ ازمنہ قدیمہ میں بحیرہ روم کو دنیا کا مرکز قرار دیا جاتا تھا اور جہتوں کا تعین اسی کے حساب سے ہوتا تھا۔ اس کے مشرقی اطراف میں واقع علاقوں کو مشرق اور اس کے مغرب میں واقع علاقوں کو مغرب سے تعبیر کیا جاتا تھا"

"The term 'ORIENT' has been used in western culture discourses to designate the area east of the Mediterranean, including the near East, Middle East, and Central and South Asia."(۳)

تحریکِ استشراق کا آغاز مغرب سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ اس کا تحقیقی اور مطالعاتی مرکز و محور مشرق تھا۔ اس تحریک کے آغاز، اہداف اور مبسوط لائحہ عمل پر بات کرنے سے قبل لفظ استشراق اور مستشرق کی صراحت میں چند لائقِ ذکر افہام پیشِ نظر رہنے چاہیں(۴):

"Anyone who teaches, writes about, or researches the Orient—and this applies whether the person is an anthropologist, sociologist, historian, or philologist—either in its specific or its general aspects, is an Orientalist, and what he or she does is Orientalism."

اسی نوع کی ایک اور رائے(۵):

"مشرقی زبانوں، آداب اور علوم کے عالم کو مستشرق کہا جاتا ہے اور اس علم کا نام استشراق ہے۔"

استشراق کی بابت ایک سے زائد بیانیے (NARRATIONS) موجود ہیں، جو اس کی مختلف جہتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً ایک بیانیہ اس مکمل ضابطے ہی کو تشکیک اور منفی عزائم کا حامل قرار دیتا ہے کہ اس تحریک کی اساس ہی میں اسلام دشمنی، بانیٔ اسلام سے عداوت اور مشرق پر تفوق کا جوہر موجود ہے۔ اس ضمن میں محققین کے ہاں اسناد کا ناختم ذخیرہ موجود ہے؛ جبکہ دوسرا بیانیہ سراسر اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ تحریکِ استشراق خالصتاً ایک علمی اور فکری کاوش ہے اور خاور شناسی کا مقصد و ہدف، دانائی کا حصول اور اس کا عملی ابلاغ ہے؛ اور یہ کہ غیر ضروری اور تعصب کی بنیاد پر، اس برتر تحقیقی جستجو کو کم مایہ ثابت کیا گیا ہے۔

راقم کا تحقیقی مطالعہ اول نوع کے بیانیہ سے، ایک حد تک قربت لیے ہوئے ہے تاہم اس فرق کے ساتھ کہ کچھ افرادو شخصیات ایسی رہی ہیں جن کے علمی خلوص کی بابت کوئی دورائے نہیں اور ان لوگوں نے واقعتاً حصولِ علم اور انسانی خدمت کی غرض کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی زندگیوں کے بہترین ایام، خاور شناسی میں صرف کیے۔ تاجِ برطانیہ، فرانس، پرتگال، ہالینڈ اور روس کے لیے مشرق (وسط ایشیا سے مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیا تک) سلطنت کی وسعت یا کاروباری منڈی کے لیے ایک جہانِ نوع کی حیثیت رکھتا تھا لیکن المانیوں کے لیے مشرق کا وجود، خوابیدہ رومان اور دانائی کا مرکز رہا۔ یہی سبب ہے کہ گوئٹے سے آنیماری شمل تک المانوی مستشرقین کا طرزِ احساس دیگر مغربی ممالک کے برعکس انسیت اور شیفتگی کا رنگ لیے ہوئے ہے، اور جسے بعض ناقدین نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

مشرق، ازمنہ قدیم ہی سے، مغرب کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی پراسرایت، دیومالا، مذاہب، تہذیب و ثقافت، زبانیں، ادب اور مصالحہ جات سے ریشم تک مختلف النوع اشیاء و مظاہر، اہلِ مغرب کے لیے دلچسپی کے منہاج رہے۔ مشرق کی بابت تحیر اور سرّیت کا پس منظر ہمیشہ سے موجود رہا، اور اسے رومانی انداز پر دیکھنے کا معاملہ آج بھی شگفتہ و تروتازہ ہے؛ تاہم اس کے ساتھ ساتھ مشرق کو نسلی اور فکری اعتبار سے کم مایہ سمجھا گیا۔ یعنی ایک جانب تو مشرق ان کے لیے بھرپور کشش کا حامل منطقہ ہے اور دوسری جانب مشرق کو بہ نگاہِ حقارت بھی دیکھا جارہا ہے۔ کشش کا تعلق سرّیت، ادیان، لسان، تجارت اور منڈی وغیرہ سے جڑا ہوا ہے اور احقر جاننے کا معاملہ نسلی، مذہبی اور فکری برتری سے گتھا ہوا ہے (٦):

> "مغرب کے احساسِ برتری کے عناصر میں ایک عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا۔ سلطنتِ روما کے خاتمے کے بعد نشاۃِ ثانیہ تک مغرب کی اہم ترین قدر ان کا مذہب ہی تھا۔ اس دور میں پورا مغرب چرچ کی گرفت میں تھا"

اور بات صرف نشاۃِ ثانیہ تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ہندوستان کی انیسویں صدی اس امر کی شاہد ہے کہ مذہبی انتہا پسندی جسے مغرب عہدِ مظلمہ (DARK AGES) کا سب سے بڑا جوہر جانتا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیگر نو آبادیات طالع آزماؤں کا ایک ایسا افادی رویہ تھا جس کو برتنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ایک نوع کا اہم، نو آبادیاتی جواز تھا کہ آخر دور افتادہ، پسماندہ اور غیر منظم لوگوں پر حکومت، کیوں اور کس سبب کی جائے؟ اور وہ بھی دھونس جماتے ہوئے ان کے منشاء ورضا کے بغیر؛ اور اگر ہم اس جانچ میں مزید پیچھے جائیں تو اس کی فکری رویّے کی پشت پر بازنطینی

شہنشاہت(مشرقی رومن ایمپائر) کھڑی نظر آتی ہے جو مغرب میں زوال پذیر ہونے پر، مشرق میں قریباً ایک ہزار برس، برسرِ اقتدار رہ کر، عثمانی خلافت کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے لیکن اس کے آدرش، ریاستی امور کے ضابطے، اہلِ مغرب کے لیے مسلمہ اصول بن جاتے ہیں اور وہ اس شہنشاہت کے خاتمے کے بعد بھی فروغِ دین کے لیے متحرک رہتے ہیں؛یعنی وہ الوہی مقصد جو بازنطینی ریاست کو فعال اور قائم رکھنے کا ایک اہم جواز فراہم کرتا تھا وہ کسی نہ کسی صورت نشاۃِ ثانیہ کے عہد انسانیت (HUMANISM) میں بھی فعال رہا اور سلطنتِ روما، تاجِ برطانیہ کی صورت، دوسری جنگِ عظیم تک، مکمل طمطمراق سے قائم دائم رہی(۷):

> "شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیوسنس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں بپٹسٹ مشن کی طرف سے شائع ہونے والا انتہائی دلآزار لٹریچر پہلے فورٹ ولیم میں سنسر کیا جاتا تھا کہ ابھی ہندوستان میں مسیحی مشن کو یونین جیک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹو نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا کہ یہ ہندوؤں کے لیے بے حد اشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام کے مشہور مشنری ڈاکٹر مارش مین نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا اور اس کے بودے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیرِ سایہ زندہ رہنا اس کے لیے برکتِ الٰہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمڈن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہو گا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے"

افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں منٹو نے کمال مہارت سے 'ہاف کاسٹ' کا تذبذب ذہنی شفاخانہ میں کچھ اس طرح سے دکھایا(یہ تقسیمِ ہند کے وقت انتہائی حراساں تھے) کہ انگریز سرکار کے چلے جانے کے بعد، اُن سے کس نوع کا برتاؤ ہو گا؟ انھیں بریڈ کھانے کو ملے گی یا پھر 'بلڈی چپاتی' پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا؟ صرف ایک فقرے سے مکمل سماجی رویہ سامنے آجاتا ہے۔

بازنطینی ریاست کا تعلق عہدِ مظلمہ (DARK AGES) سے تھا جس کا عرصہ حیات عموماً پانچویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک شمار کیا جاتا ہے اور جس کی اساس، سخت گیر مذہبی عقائد پر تھی لیکن عہد انسانیت میں اس کا اِحیاء سلطنت کی توسیع سے فروغ پا رہا تھا؛یعنی اقوامِ مشرق کی تہذیبی و معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد کی

درستی کا ذمہ بھی نو آبادکاروں نے اپنے تئیں اٹھالیا۔ اردو ادب کے ایک اہم محسن 'گل کرسٹ' کی بابت ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ کہنا توجہ کا حامل ہے(۸):

> "۱۸۰۴ء میں ہندوستانی شعبے کے لیے گل کرسٹ نے مباحثہ کا جو عنوان تجویز کیا تھا وہ متنازعہ فیہ قرار پایا۔ عنوان یہ تھا' اگر ہندوستانی باشندے عیسائی اصولوں کا مقابلہ اپنی مذہبی کتابوں سے کریں تو وہ عیسائیت قبول کر لیں گے' اس موضوع سے کلکتہ کے مسلمان حلقوں میں شدید احتجاج پیدا ہوا۔ اس احتجاج کو دیکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی حلقوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ موضوع سرکاری حکمتِ عملی کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا انھوں نے اس کے خلاف عرضداشت بھجوائی۔ ولزلی کو اس موضوع میں کوئی پریشان کن مسئلہ نظر نہیں آیا مگر کلکتہ کے مقامی حلقوں کے احتجاج کو دیکھ کر اُس نے اِس موضوع کو بدلنے کا حکم صادر کر دیا۔ گل کرسٹ نے اس حکم کو اپنے شعبہ میں مداخلت قرار دیا اور اس غم و غصہ کی حالت میں اس نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا"

اس مذہبی تفاخر کے پسِ پردہ وہ جملہ عقائد و نظریات تھے جو اہلِ مغرب کے ہاں صدیوں پروان چڑھتے رہے۔ ان کے نزدیک اسلام غیر ضروری طور پر دینِ عیسوی کی اشاعت میں سدِ راہ ہوا۔ اس سے عیسائی تبلیغ متاثر ہوئی۔ اسلام جن مغربی علاقوں تک پھیل چکا تھا اُس سے اِن کی تہذیبی معاشرت کو بہت زک پہنچی۔ عہدِ وسطیٰ کے لوگ خاص طور سے اس بابت متفکر و مضطرب تھے۔ ان کا الوہی مقصد تشنہ رہ گیا۔ ان کے نزدیک عیسائیت کے بعد اقوامِ عالم کو اب مزید کسی دین کی ضرورت نہ تھی اور یوں بھی وہ اسلام کو یہودی اور عیسائی عقائد کا چربہ سمجھتے تھے۔ صلیبی جنگیں ہوں یا سقوطِ قسطنطنیہ یا پھر اسپین، سسلی اور یوگوسلاویہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو، غرض مغرب کا مسلمانوں، ان کے عقائد و نظریات اور نبی اکرمؐ کی بابت معاندانہ رویہ، شدت سے عہد بہ عہد فروغ پاتا رہا۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی سے اشپرنگر کی سیرتِ نبویؐ تک اس غیر معتدل اندازِ فکر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح ہونے کا قلق اور اس پر مستزاد تہذیبی اور اقتصادی شکستگی نے اسلام کی بابت نفرت پر مبنی نظریات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلام اور داعی اسلام حضرت محمدؐ کے حوالہ سے منصف اور معتدل تصور ناپید رہا(۹):

> "From the End of the seventh century until the battle of Lepanto in 1571, Islam is its Arab, Ottoman, or North African and Spanish form dominated or effectively threatened European Christianity.

That Islam outstripped and outshone Rome cannot have been absent from the mind of any European past and presen."

اس تصادم کے نتیجہ میں مشرق اور مغرب کے مابین فکری بُعد اور نفرت کی ایک بڑی خلیج حائل ہو چکی تھی۔ صلیبی جنگوں پر جانے والے بہادر جنگ جو(KNIGHTS) مجاہد کہلائے اور ان کے مقابل آنے والے مسلمان، کافر(INFIDELS) سمجھے گئے، اور کم و بیش یہی عقیدہ، صلیبیوں کی بابت مسلمانوں کا تھا۔ دونوں ابراہیمی مذاہب کے ماننے والے شہادت کی صورت میں، جنت میں جانے کے خواہاں تھے۔ اذہان پر ان جنگوں کا اثر، آج بھی، اہلِ مغرب کے ہاں، خاص طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد امریکی صدر کا رویہ یا بوسنیا میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے بعد سرب جنرل کا میڈیا کے سامنے آن کر، برملا مسلمانوں کی بابت نفرت پر مبنی گفتگو کرنا، غرض ان سب کے ڈانڈے ماضی کے ان واقعات سے جڑتے ہیں جو کبھی اسلام اور عیسائیت کی مخاصمت کی صورت میں یاد رکھے گئے ہیں۔

ایڈورڈ سعید مشرق کی بابت تحقیر آمیز رویے کی کھوج میں اسلام اور عیسائیت سے قبل کے ادوار کو سامنے لاتے ہیں اور ایسی اسناد فراہم کرتے ہیں جس سے اہلِ مغرب کا تفاخر نمایاں ہوتا ہے(۱۰):

"Aeschylus portrays the sense of disaster overcoming the Persians when they learn that

Their armies, led by King Xerxes, have been destroyed by the Greeks. The chorus sings

The following ode:

Now all Asia's land Moans in emptiness. Xerxes led

forth, oh oh! Xerxes destroyed, woe woe!

Xerxes' plans have all miscarried."

یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ مغرب تہذیبی و فکری حوالوں سے ہمیشہ اہل یونان کا احسان مند رہا اور ریاستی امور میں رومن طرزِ حکومت کو پیشِ نظر رکھا۔ قدیم یونانی معاشرت اور دانائی ان کے نزدیک ایک مشترک مغربی ورثہ

ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی اور تہذیب کی طرف دیکھنا ان کے شایانِ شان نہیں۔ فلسفہ ، نفسیات اور دیگر متداول علوم میں قدیم یونانی(HELLENIC)اوتار، واقعات اور اساطیری قصوں کی بھرمار ہے۔ یہاں تک جدید نفسیات میں ہمیں یونانی دیومالا اور کرداروں کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے۔ احساسِ برتری کا یہ ثقافتی احساس بڑھ کر نسلی افتخار کو جا پہنچا ہے؛ اور اہلِ مشرق کو بہ حقارت دیکھنے کا ایک جواز فراہم کرتا ہے۔ غرض یہ ایک طرزِ احساس ہے جو مختلف صورتوں میں وقوع پذیر رہا اور تاریخی اعتبار سے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی(۱۱):

> "the Middle East does not attract scholarly attention because of its intrinsic weaknesses- we have an almost exact duplication of a canonical Orientalist opinion that the Semites never produced a great culture and that, as Renan frequently said, the Semitic world was too impoverished ever to attract universal attention."

صلیبی جنگوں کے بعد بالعموم اور سقوطِ قسطنطنیہ کے بعد بالخصوص اہلِ مغرب اس حقیقت سے بہرہ مند ہو چکے تھے کہ ان سے مزاحم اسلام، تلوار کی طاقت سے زیر نگیں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے انھیں کچھ اور وسائل بروئے کار لانا ہوں گے اور اس ضمن میں اول، اسلام کا دقیق مطالعہ اور پھر اس میں موجود ان پہلوؤں پر نگاہ جمانا تھا جس سے اس مذہب کے ماننے والوں میں افتراق و انتشار کے اسباب پیدا ہوں۔ اس بابت اسلامی تاریخ، سیرت، فقہ، حدیث اور خاص طور سے قرآنِ حکیم کو منتخب کیا گیا۔ ان کے پیشِ نظر، اسلامی علوم میں مہارت کا مقصد اپنے مخالف کی جمعیت اور قوت کو کمزور کرنا تھا۔ وہ اسلام اور سلطنتِ عثمانیہ کو اپنا حریف جان رہے تھے۔ متن کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے، اور اس کی برتر عملی افادیت سے، مستفید ہونے کا ارادہ باندھ چکے تھے؛ اور یہ سب ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت وقوع پذیر ہونے لگا(۱۲):

> "But the Crusades had a chastening influence on Christendom. Instead of attempting to regain former Christian territory by force of arms, instead of fighting the 'Saracen', a new approach had gradually been gaining recognition. Thus Francis of Assisi sought, through missionary persuasion, to evangelize the 'infidels', and

Raymond Lull, with similar motives in mind, was instrumental in the introduction of the teaching of Arabic in Christian institutions of higher learning. But the aim was still largely destructive, hostile: to know more about Islam so as to be better equipped to expose its 'defects'. Indeed, Peter the Venerable, who encouraged the first Latin translation of the Qur'an, was himself the author of a vehement polemic against Islam."

مستشرق، اسے کہا جارہا تھا جو اسلام اور عربی زبان و ادب کے کسی ایک پہلو پر تحقیقی گرفت رکھتا ہو اور مشرق، مسلم ریاست کے جغرافیے کی صورت، مشخص ہونے لگا۔ استشراق کے آغاز کی بابت ایڈورڈ سعید اور اس کے اہداف کے بارے میں ڈاکٹر عبد القادر جیلانی کی آراء بالترتیب لائقِ توجہ ہیں(۱۳):

"In the Christian West, Orientalism considered to have commenced its formal existence with a decision of the Church Council of Vienne in 1312 to establish a series of chairs in "Arabic, Greek, Hebrew, and Syriac at Paris, Oxford, Bologna, Avignon, and Salamanca."

"مستشرقین کا وجود کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے ذمہ دار اصحابِ فکر تھے جو صدیوں سے عالمِ اسلام کے ساتھ حالتِ جنگ میں مبتلا تھا اور عالمِ اسلام کو ہر قیمت پر نابود یا کم از کم مغلوب کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ جس نے اپنی کمزوریوں کی تشخیص کر لی تھی اور جسے دشمن کی برتری کے راز معلوم ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔علومِ شرقیہ کا مطالعہ اسی جنگی منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ مستشرقین اس منصوبے کے اہم کارکن تھے۔ وہ روحانی حروف صلیبیہ کے ہراول دستے تھے۔ جن کا فرض یہ تھا کہ وہ دشمن کے خزانوں سے اپنے ملک کو مالا مال کریں اور ان کمزور مقامات کو دریافت کریں، جہاں سے دشمن پر حملہ آور ہوا جا سکے۔"(۱۴)

خاور شناسی کا یہ سلسلہ کئی صدیوں کو محیط رہا۔ اب نبرد آزمائی کے لیے کوئی عسکری میدان نہ تھا بلکہ فکر و عمل کا اک جدا راستہ اختیار کیا گیا جس کا مطمحِ نظر، واضح طور پر اسلام کی شکست و ریخت سے مشروط تھا۔ ایک بھرپور اور مستعد

کاوش کا آغاز ہوا، اور اسلام کے ان فکری گوشوں کو باریک بینی سے دیکھنے کا بیڑا اٹھایا گیا جس کا مقصد مذہب اور اس کے پیروکاروں کے درمیان مناشقات اور روحانی خلیج پیدا کرنا تھا۔ عقیدے کی کمر توڑنے کے لیے داعیٔ اسلام کی تواتر سے کردار کشی کی گئی۔ معروضی طور پر یہ دکھانے کی کوشش ہوئی کہ اسلام اور فطری تقاضوں میں ایک نوع کا بُعد ہے، اور اسلام کا جو ادّعا ہے کہ وہ دینِ فطرت پر قائم ہے، سراسر غلط اور حقیقت کے منافی ہے۔ اسلامی متن کا مطالعہ اُن زاویوں سے کیا گیا جس سے اِس دین کی کجی سامنے لائی جاسکے۔ پندرھویں صدی کے ابتدائی عشروں میں سالامانکا(SALAMANCA)یونیورسٹی میں الٰہیات کے پروفیسر جان آف سیگوویہ اور جرمن فلاسفر، ماہرِ الٰہیات نکولس آف کیوسہ(NICHOLAS OF CUSA) کس نوع کی کارگزاریوں میں منہمک تھے اس کی ایک جھلک کچھ یوں ہے(۱۵):

> "جان آف سیگویہ قرآن کے دقیق مطالعہ کے بعد اس میں خامیاں دریافت کرکے (مسلمانوں پر) یہ ثابت کرنے کا داعی تھا کہ یہ کلامِ ربانی نہیں ہے۔ وہ ہتھیاروں کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے اسلام کو شکست دینے کا حامی تھا۔ نکولاس آف کیوسہ اختلافی مسائل سمیٹ کر مجتمع کرنا چاہتا تھا اور اختلافی وجوہات ختم کرکے مسلمانوں کو دائرہ عیسائیت میں داخل کرنے کا متمنی تھا"

اسی بیانیے میں ایک اور اہم رائے(۱۶):

> "اسلام کے بارے میں روایتی تحقیر ایک غیر معتدل فرقہ پرستی کی شکل میں ان کے مطالعات میں سرایت کرنے لگی۔ یورپ اور عالمِ اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں نے جو خلیج پیدا کردی تھی اس کو پاٹا نہیں جاسکتا۔ پھر اسلام سے نفرت یورپی فکر کا حصہ بن گئی۔ دراصل ابتدائی مستشرقین دورِ جدید میں وہ مسیحی مبلغین تھے جنھوں نے عالمِ اسلام میں مشنری سرگرمیوں کو فروغ دیا۔۔۔۔۔استشراق اگرچہ بعد میں مشنری نفوذ سے آزاد ہوگیا"

یعنی تحریکِ استشراق مذہبی اور سیاسی تعصبات سے فروغ پاتی رہی، اور یہ فکری تسلسل انیسویں صدی تک کسی نہ کسی صورت موجود رہا، تاہم اس فرق کے ساتھ کہ نشاۃِ ثانیہ کے بعد جب مغرب ریاستیں یکے بعد دیگرے پاپائیت کے دائرہ اختیار سے باہر نکل کر قومیت کی بنیاد پر معاشرت کی تشکیل میں منہمک ہوئیں تو ایسے میں استشراق کا استعمال مغربی ریاستوں اور اس کے باشندوں کی بہبود کے لیے ہونے لگا۔ اسلام اب مغرب کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہ تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا دم خم نکل چکا تھا اور مغرب، سائنسی علوم کے بہت سے اہم مراحل طے کرچکا تھا۔ سیاسی معیشت

اب اقوامِ مغرب کا نصب العین تھی۔ وہ عیسائیت اور اس کے فروغ کی بابت ایک حد تک جاسکتے تھے۔ مذہب کی جگہ وطن پرستی اور قوم پرستی فروغ پانے لگی۔ مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کے تین مراحل طے ہو رہے تھے۔ ابتدائی، اعلیٰ وارفع اور اخروی نشاۃِ ثانیہ کے باطن سے ریاست کی توسیع کے سوتے پھوٹنے لگے۔ مغرب بااعتماد تھا۔ وہ مسلم افکار، معاشرت، عقائد و نظریات غرض ہر سمت میں ٹوہ لگا چکا تھا۔ اب اسلامی مشرق سے انھیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ اور یہ کیسا اتفاق ہے کہ ایک ہی دور میں برطانیہ، فرانس، پرتگال، ڈچ، ڈینش اور نارویجین ایسٹ انڈیا کمپنیاں وجود میں آتی ہیں اور وہ کمال سرعت سے سترھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوتی ہیں اور ان کے ہاتھوں مقامی بندرگاہیں اور علاقے بتدریج مفتوح ہونے لگتے ہیں، یعنی معاشی فراخی کے لیے سیاسی تسلط قائم کرنا ناگزیر تھا۔ اب مذہب خود مغرب کے لیے کوئی بڑا آدرش نہ رہا تھا۔ اصل اہمیت اور حیثیت سرمائے کو حاصل ہو چکی تھی۔ مذہب ثانوی حیثیت میں، فروغ پاتا رہا۔ تجار کی صورت، ساحلوں پر لنگر انداز ہونے والے، اپنے سرمائے کے تحفظ کی خاطر، اسلحہ سے لیس ہونے لگے۔ کبھی آپس میں لڑتے بھڑتے تھے اور کبھی اوروں کو لڑتا دیکھ کر تماشا کرتے تھے۔ درحقیقت یہ قدیم رومن مقولے DIVIDE AND RULE کو عملی طور پر برت رہے تھے۔ حالات خاص طور سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی موافقت میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ۱۷۰۷ء یعنی اورنگزیب کی وفات کے بعد سلطنت کمزور پڑنے لگی اور بدقسمتی سے خطے کے لوگوں کی اکثریت جدید علوم سے ناآشنا تھی۔ یہاں ہندوستان میں بادشاہت اور تمن داری کے سبب لوگوں کا طرزِ رہن سہن ایک سا رہا جبکہ مغرب میں صنعتی انقلاب نمو پانے لگا۔ یہاں کے باشندے جو پہلے ہی مطلق العنان حکومتوں کے آگے مزاحم نہ ہوتے تھے، انھیں باقاعدہ منصوبے کے تحت نوآبادیات کا حصہ بنانا، دشوار نہ تھا۔ استشراق اس ضمن میں اب ایک اور طور سے مغرب کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل میں جٹ گیا اور افریقہ سے ایشیا تک کے وہ علاقے نوآبادیات کا حصہ بننے لگے جو وسائل سے مالا مال اور سماجی اعتبار سے انتہائی پسماندہ تھے۔ اب ریاست کی توسیع کا مقصد الوہی نہ رہا۔ اس کی جگہ کاروبارِ معیشت لے چکا تھا۔ یہ معاملہ مغربی ریاستوں کے مابین، خوفناک حد تک، حساس صورت اختیار کر چکا تھا، اور وہ ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر آمادہ رہتے تھے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا منافع، دنیا کی تمام معیشتوں کے منافع کے نصف تک آن پہنچا تھا۔ اتنی اہم کامیابی، ہندوستان کو جانے بغیر حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ توسیع پسندانہ عزائم واضح ہونے لگے، اور پہلے جو استشراق مذہبی اکھاڑ پچھاڑ میں متحرک تھا اب ریاست کی سیاسی معیشت کا محافظ بن گیا۔ یہ بیانیہ اپنے باطن میں بہت سی تلخ اسناد لیے ہوئے ہے۔ اہلِ مشرق یا ہندوستان پر حکومت کرنے کے متعدد جواز فراہم کیے گئے۔

اہلِ مشرق پسماندہ، گنوار اور اجڈ لوگ ہیں۔ انھیں بہترین معاشرت کی ضرورت ہے۔ سماجی اعتبار سے یہ مفلوک الحال لوگ، ٹھیک طور سے اپنی نمائندگی کا حق بھی ادا نہیں کر سکتے۔ ان کی بہترین نمائندگی کے لیے اہلِ مغرب کو آگے آنا چاہئے۔ وسائل ہونے کے باوجود ان کے ہاں ڈھنگ کا انفراسٹرکچر موجود نہیں، اہلِ مغرب کو خاص طور سے اس ضمن میں ان کی معاونت کرنا ہوگی۔ یہ لوگ جدید علوم سے بے بہرہ ہیں اور یہ ایک نوع کی الوہی خدمت ہوگی کہ انھیں زیورِ علم سے آشنا کیا جائے۔ مشرقی باشندے ٹھیک طور سے حالات کا تجزیہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے ۔ضیعف الاعتقادی، غیر معقول تجزیاتی رویہ اور گجلک اندازِ فکر ان کے مخصوص شخصی وضائف ہیں جن کے ہوتے یہ کسی بھی طور جدید مغربی ذہن کی ہم سری نہیں کر سکتے اور یہ کہ نسلی اعتبار سے یہ کج فہم اور بے عمل لوگ ہیں لہذا یہ نسلِ انسانی کی اعلیٰ خدمت ہوگی کہ اِنھیں اُن خوبیوں سے متصف کیا جائے جن کی انھیں اشد ضرورت ہے۔ گورے کی یہ اخلاقی ذمہ داری(WHITE MAN BURDEN) مملکت کی توسیع کے لیے ،وہ عذرِ بے بہاجانی گئی جو نسل در نسل، کم و بیش، تین صدیوں کو محیط رہی اور آج بھی اہلِ مغرب کا یہ اندازِ فکر، زمینی حقائق کے باوصف، کچھ زیادہ بدلاؤ نہیں رکھتا۔ ذیل کے یہ اقتباسات بین السطور بیانیے کے موئد ہیں(۱۷):

> "During the nineteenth and twentieth centuries, the Orientalists became a more serious quantity, because by then the reaches of imaginative and actual geography had shrunk, because the Oriental –European relationship was determined by an unstoppable European expansion in search of Markets, resources, and colonies, and finally, because Orientalism had accomplished its self-metamorphosis from a scholarly discourse to an imperial institution."

> "Finally, with twentieth –century nationalist movements of decolonization, orientalism acquired a third meaning when some nationalist activists and scholars argued that scholarly discipline of Orientalism could not be understood apart of its production, namely, western imperialism."(۱۸)

مشرق اور خاص طور سے جنوبی ایشیا کو سیاسی اور معاشی طور پر زیر نگیں کرنے کے لیے، اس بڑے زمینی خطے پر بسنے والے لوگوں سے شناسائی کا معاملہ حساس نوع کا تھا۔ مذہبی اقدار، رسوم ورواج، معیشت، سیاست اور خاص طور سے زبان ایک ایسا ذریعہ، وسیلہ تھا جو کسی بھی تہذیب کے باطن کو پوشیدہ نہیں رہنے دیتا۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائی مستشرقین خاص طور سے لسانیات(PHILOLOGY) کی طرف راغب ہوئے اور مقامی، قدیمی اور متداول زبانوں پر عبور حاصل کیا، اور ان کے توسط سے خطے کے ماضی اور حال، تہذیب وثقافت، قوموں، نسلوں کی نفسیات اور شخصی، کرداری اوصاف سے آگاہی حاصل کی اور یہ شعبۂ تحقیق اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلسل فروغ پاتا رہا۔ زبان ایک نوع کا درّہ تھا جس سے گزر کر ہی ایک نئی دنیا کو دیکھنا اور ایک نئے تمدّن کو جاننا تھا۔ حکمرانی کرنے کے لیے مکمل تعارف ضروری تھا اور یہ مکمل تعارف زبان ہی کے وسیلہ سے حاصل ہوا۔ ایڈورڈ سعید نے درست کہا کہ ہندوستان کا مطالعہ ایک متن کے طور پر کیا گیا۔ متن کتنا زور آور ہوتا ہے اس سے بدیسی طالع آزما بخوبی آگاہ تھے۔ علمی سطح پر بڑے زوروں سے زبانوں کی بابت آگاہی کا ڈول ڈالا گیا اور بعض مستشرقین اس ضمن میں اتنی مہارت لیے ہوئے تھے کہ مقامی زبانوں کے اساتذہ ششدر رہ گئے۔ تمام بڑی زبانوں کے متون کھنگالے گئے۔ ان کو از سرِ نو چھاپنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں موجود مٹی ہوئی قدیم تہذیبوں کا سراغ لگایا گیا۔ قدیم اور متداول ادب کو جانچا گیا۔ غرض مغرب کا بڑھتا ہوا لسانی اشتیاق جہاں ایک طرف سلطنت کی توسیع میں معاون تھا تو دوسری جانب حصولِ علم کی تکمیل میں افزودگی کا باعث بھی بنا۔ اس سے جہاں استشراق کی تحریک توانا ہو رہی تھی وہیں اہلِ مغرب، خاص طور سے انگلستان اور فرانس میں خود اعتمادی بڑھ رہی تھی۔ انسانی اور زمینی حقائق مترشح ہونے لگے۔ ایک غیر ثقافت سے وہ خود بھی جڑنے لگے۔ کوئی شے اب اندھیرے میں نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ کام چند دنوں یا ہفتوں میں نہ ہوا تھا اس کے لیے باقاعدہ ایک منصوبہ، لائحہ عمل بنایا گیا۔ ابھی ولیم جونز ہندوستان کے ساحل پر اترا نہ تھا کہ اس نے آئندہ کے تحقیقی اور علمی منصوبوں کو صفحہ قرطاس پر کھینچ ڈالا۔ وہ خطے کی مقامی زبانوں سے لے کر یہاں کے رسوم ورواج، ہندو مسلم قوانین، قدیمی عہد کی تاریخ، صحائف کی صحت بابت حقائق کی تلاش، جدید سیاست اور ہندوستان کا جغرافیہ، سیلِ عظیم کی بابت روایات، علم الاعداد، جیومیٹری اور ایشیا کی مشترکہ سائنس، ادویات، کیمیا، جراحت، علم الاعضاء، ہندوستان کی فطری پیداوار، شاعری، خطابت، اخلاقیات، موسیقی، تبت، کشمیر، تجارت، صنعت و حرفت، زراعت، شماریات، مغل اور مرہٹہ آئین غرض جو کام ایک بڑے ادارے کو

اپنے ذمّے لینا چاہئے تھا، اس کا بار، تنِ تنہا خود انھوں نے اٹھالیا۔ یہ تاریخِ انسانی کی ایک بے مثل صورتحال تھی؛ اور یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ اپنی ہندوستان آمد کے فوراً بعد ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی(۱۹):

"اس (ولیم جونز) نے اپنے عہد کے مسائل کا تصور اپنے فرائضِ منصبی سے کہیں آگے جا کر کیا۔ چنانچہ ابھی تین ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ء کو ایشیاٹک سوسائٹی کا ڈول ڈال دیا۔ ہندوستان میں نئے سال کا آغاز، استشراق کے نئے عہد کا پیش خیمہ بنا"

ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کی وجہ کچھ بھی ہو، یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ولیم جونز کو جلد یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس اکیلے کے لیے اقلیمِ علم کی سرحدوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اور شاید یہی اس کی واقعیت پسندی تھی۔ مذکورہ علمی اہداف کا خاکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس فردِ واحد کے لیے ان فکری گوشوں کی تلاش اس قدر ضروری نہ تھی، اور ان کا حصول ذاتی حوالہ سے، خود ان کے لیے کسی اہم کارگزاری کا وسیلہ نہ بن سکتا تھا کہ ایسے میں مہارت اور تفحص کا فقدان یقینی تھا جو ان کی شہرت اور علمیت کو داغدار کر سکتا تھا اور ولیم جونز ایسی شخصیت جن کی مدح میں لائقِ ذکر آراء ملتی ہیں، کسی بھی طور ایسی صورتحال قبول نہ کر سکتے تھے(۲۰):

"جونز کا یہ کہنا ہے کہ تمام انسانی علم، انسان کی تین ذہنی صلاحیتوں: یادداشت، استدلال اور تخیل کی پیداوار ہے اور تمام انسانی علوم (تاریخ، سائنس اور آرٹ) ان تین صلاحیتوں کی پیداوار ہیں، اس کے آفاقی نقطہ نظر کا اظہار ہے"

"Sanskrit, Indian religion, and Indian History did not acquire the status of scientific knowledge until after Sir William Jones's efforts in the late eighteenth century, and even Jones's interest in India came to him by way of his prior interest in and knowledge of Islam."(۲۱)

سر ولیم جونز جن کے تبحر کی بابت، بہت کچھ کہا گیا ہے؛ ان کی پر خلوص علمی مساعی نے، پیش آیند مستشرقین کے لیے گراں قدر، در وا کیے۔ وہ ایک ایسے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں سے استشراق کے عمیق اور ثمر آور سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی کاوشیں سراہی گئیں اور آج ان کا نام، استشراق کے پس منظر میں، احترام سے لیا جاتا ہے(۲۲):

"No other orientalists, Pauthier later affirmed, had so broad a range of knowledge at his disposal as Jones did. Jones himself acknowledged that he had a thorough knowledge of thirteen of the twenty-eight languages he had studied. His open-hearted nature and his curiosity, his penetrating intuition, his ardor, and his grace can all be read in his features, preserved, fortunately, in the portrait by Joshua Reynolds and reproduced in engravings as early as 1779 and 1782. It seems fitting that his name should be given to a formerly mythical tree: Jonesia Asoka"

جونز عملاً کیا چاہتے تھے؟ اور توسیع پسندانہ امور میں، ان سے اور دیگر بڑے اذہان سے کیا کام لیا جا سکتا تھا، اس بابت ذیل کی آراء اہمیت کی حامل ہیں(۲۳):

"Jones wanted to administer justice in Calcutta and from Pondi cherry to Bombay, he was able to accomplish what Anquetil had first set out to achieve."

"The decisive period in Indic studies began with the arrival of English civil servants in Calcutta around 1780, who supported by the governor, Warren Hastings, began an extraordinary undertaking. Learning does not undermine its own course alone, and the initial intention, conversion, yielded to or was intermingled with another intention, conquest. The aim in this period was no longer to clear a path of knowledge but for administration."(۲۴)

ہمارے خطے میں بھی استشراق کے مخصوص اہداف تھے اور ولیم جونز ایسی مقتدر شخصیات بھی برطانوی سامراج کے استحکام میں معاون رہیں۔ یہ بیانیہ متعدد، مستند آراء کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس کے متبادل بیانیے کو زیرِ بحث لائیں، مناسب ہو گا کہ ہم اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اہم مستشرقین اور ان دو صدیوں میں رونما

ہونے والی تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالیں اور برطانوی، فرانسیسی اور خاص طور سے جرمن استشراق کی بابت کچھ اہم امور کی نشاندہی کریں۔

اس ضمن میں ایک اہم رائے یہ بھی ملتی ہے کہ ابتدائی مستشرقین درحقیقت بائبل میں موجود دیگر زبانوں کے الفاظ کی بہتر تفہیم کے لیے لسانیات کے شعبے کی طرف راغب ہوئے۔ کچھ ایسی ہی صورت ہندوستان میں اٹھارہویں صدی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ تاہم انیسویں صدی میں کیا اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کی بابت ذیل کی آراء خاص طور سے دیکھی جاسکتی ہیں(۲۵):

> "By and large, until the mid-eighteenth centuries Orientalists were biblical scholars, students of Semitic languages, Islamic specialists, or, because the Jesuits had opened up the new study of China, Sinologists.....by the middle of the nineteenth century Orientalism was as vast a treasure-house of learning as one could imagine."

> "In the nineteenth century orientalists representations of supposedly exotic cultures became commonplace themes in art, literature and music. Many leading artists (and many not so leading ones), including Mozart, Flaubert, and Delacroix (to mention but three), made extensive use of Orientalist settings, motifs, and tropes in their work."(۲۶)

مذکورہ دو صدیاں استشراق کے ضمن میں انتہائی ثمر آور ثابت ہوئیں، اور قریباً ہر موضوع اور پہلو پر گرانقدر کاوشیں منظرِ عام پر آئیں۔ ان سب کا یہاں تفصیلاً ذکر، اک جدا مقالے سے مشروط ہے تاہم چند اہم مستشرقین کی بابت گفتگو ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں برطانوی، جرمنی اور فرانسیسی استشراق کے بہت سے اہم نام، اپنی منفرد اور بے مثل کارگزاریوں کے سبب آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے اصل اہداف کچھ بھی ہوں، یہ ماننا ہوگا کہ ان کی علمی اور تحقیقی کدوکاوش کے سبب اس خطے کے لوگ بہر طور مستفید ہوئے۔ لوگوں میں لکھنے پڑھنے کی جستجو اور چیزوں کو

منطقی انداز پر، پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی؛ بہت سی توہمات اور غیر سائنسی استدلال پر خود گرفت کرنے کی عادت پختہ ہوئی۔ تحقیق و تدوین کے نئے ضابطوں سے شناسائی ہوئی اور جدید مغربی طرزِ احساس سے ایک نوع کی قربت بڑھی جو نئے اور انتہائی تخلیقی رویوں کو مزاج کا حصہ بنانے میں معاون ہوئی۔ عقیدت اور فضیلت سے ہٹ کر چیزوں کو پرکھنے کا رویہ فروغ پانے لگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں بہت سی تحاریک کا آغاز ہوا۔ جدید تعلیم اور سائنسی علوم کے فروغ کے لیے باقاعدہ تنظیمیں وجود میں آئیں اور یہاں تک کہ قدیمی ادب اور زبانوں سے گلو خلاصی کا آغاز ہوا۔ بنارس میں سنسکرت کالج کی مخالفت میں روشن خیال ہندو سامنے آئے اور پیش پا افتادہ ادب سے مغائرت برتنے کا تُند جذبہ نمو پانے لگا؛ جبکہ استشراق کا اصل ہدف ہی وہ قدیم متون تھے جن کے وسیلوں سے وہ ہندوستان کو من حیث المجموع سمجھنا چاہ رہے تھے۔ غرض سرسید تحریک بھی اسی پس منظر میں جنم لیتی ہے اور نئے علوم وافکار کی تلاش میں اداروں، سوسائٹیز اور جریدوں کا اجراء ہوتا ہے اور یہ سب ایک غیر جذباتی، سائنسی استدلال سے فروغ پانے لگا،اس کی بنیاد ایک حد تک مستشرقین نے رکھی، غرض یہ ایک انتہائی پیچیدہ، تناقضاتی صورتحال تھی ۔مستشرقین کی خاور شناسی سے مغرب پسندی پروان چڑھنے لگی اور پھر ایک صورت لارڈ میکالے ایسی شخصیات کی تھی جو سرے سے ہی مشرقی علوم کے ناقد تھے،اور مشرقی علوم کو کارِ بے کاراں سمجھتے تھے۔شرق شناسی کی روایت ان کے لیے اہمیت کی حامل نہ تھی(۲۷):

> "۷مارچ ۱۸۳۵ء کی تاریخ تعلیمی پروگرام میں اہم شمار ہو سکتی ہے۔ یہ اینگلی سسٹ افراد کی فتح کا یوم ہے۔اس دن کے بعد مشرقی اداروں پر صرف ہونے والی رقم کا بہت تھوڑا حصہ ان اداروں کے لیے مخصوص رہ گیا اور حکومت کے تعلیمی فنڈ بڑی حد تک مغربی طرز کے مدرسوں اور کالجوں پر صرف ہونے لگے جن میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔۔۔۔میکالے کی رائے یہ تھی کہ انگریزی کے ذریعے مفتوحین میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جائے جو جسمانی طور پر تو مقامی ہو لیکن ذہناً اور مذاجاً انگریز ہو۔"

یعنی پہلے جو کام تبدّلِ مذہب سے لیا جاتا تھا، اب اس کا آغاز تبدّلِ لسان سے ہونے لگا۔ ترجیحات بدل گئیں، لیکن بہر حال استشراق کی تحریک متوازی سطح پر بدستور جاری رہی۔ کمپنی کے نزدیک، فورٹ ولیم کالج اب ایک سفید ہاتھی کے طور پر رہ گیا تھا۔ اس بابت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی افادیت اور مقاصد کے بارے میں مزید گفتگو،

پہلے سے موجود تحقیقی مواد کو دہرانے کے سوا، اور کچھ بھی نہیں، البتہ اس کی، اور ایشیاٹک سوسائٹی کی اہمیت کیا تھی اس بابت ایک اہم رائے کچھ یوں ہے(۲۸):

> "حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ میں قائم ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج، ایسٹ انڈیا کمپنی کے یکے بعد دیگرے وجود میں آنے والے وہ " اسٹیٹ اپریٹس " تھے جن کے ذریعے شرق شناسی کی یورپی روایت پروان چڑھی"

تحریکِ استشراق کا چھتنار درخت ٹوٹنے جارہا تھا۔ اس سے بہت سا کام لیا جاچکا تھا اور شاید زمینی حقائق پہلے سے دائم نہ رہے تھے۔ ہندوستان کو مزید سمجھنے کی اب چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ ان پر براہِ راست حکومت کرنے اور اپنے منشأ و مرضی کے مطابق یہاں کے لوگوں سے کام لینے کا وقت آگیا تھا۔ مزید تردد ات اور توضیحات میں وسائل کو جھونکنا فہم سے بالا تھا۔ استشراق سمٹ کر شخصیات اور افراد تک محدود رہ گیا؛ البتہ ادبی و فکری وسیلوں سے حظ اٹھانے کا سلسلہ جاری رہا(۲۹):

> "۱۸۵۷ء کے بعد مشرقیات کا شوق صرف پنجاب (بشمول یو۔پی) سرحد میں رہ گیا۔ ورنہ برصغیر کے دوسرے علاقے مغرب کی رو میں پوری طرح ڈوب گئے اور مشرقی زبانوں کی کشش تحریک کی بجائے افراد کی متفرق کوششوں کی مرہونِ منت رہ گئی"

۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۷ء تک جو اہم مستشرقین سامنے آتے ہیں ان کی بابت ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے کسی قدر صراحت سے اپنے مقالے میں تعارف کرایا، یہاں ان کا از سرِ نو اعادہ مناسب نہیں تاہم جو نام موصوفہ نے پیش کیے ان پر اگر سرسری نظر دوڑائیں تو سینڈ فورڈ آرنٹ(SANFORD ARNET)جان شیکسپیئر، لیبی ڈیف (LEBEDEFF) ناتھے برائس(NATHE BRICE) فرگسن (FERGUSSON)ہنری گرانٹ(HENRY GRANT)ایس سلاٹر(S. SLOTTER)این۔ایچ ولسن (N.H.WILSON)ڈبلیو۔سی۔ہاؤلنگ(W.C. HOWLING)اور ولیم یسٹس(WILLIAM YESTES) ایسی شخصیات کے نام ملتے ہیں جو مختلف شعبہ جات میں منفرد و ممتاز تھے۔ ایڈورڈ سعید نے بھی بہت سے اہم نام گنوائے جن کا جدا سے اشاریہ بنایا جاسکتا ہے البتہ انیسویں صدی کے وہ اہم مستشرقین اور انجمنیں جنھوں نے اس پورے علمی ضابطے کو عالمی سطح پر دوام بخشا ان کی بابت ذیل کی رائے وقعت کی حامل ہے(۳۰):

"The official intellectual genealogy of Orientalism would certainly include Gobineau, Renan, Humboldt, Steinthal, Burnouf, Remusat, Palmer, Weil, Dozy, Muir, to mention a few famous names almost at random from nineteenth century. It would also include the diffusive capacity of learned societies: the Societe asiatique, founded in 1822; .....the American Oriental Society, founded in 1842; and so on."

مشنری تحاریک بھی اس کے متوازی اپنا کام مستعدی سے جاری رکھے ہوئے تھیں۔ استشراق کی یہ مقصدی تبلیغی جہت، اِس فکری منظر نامہ میں نمایاں رہی البتہ ان کی مناظرانہ کاوشیں، دور رس نتائج مرتب کرنے میں ناکام ٹھہریں۔ جزوی طور پر کامیابی ضرور حاصل ہوئی لیکن چونکہ اس ضابطے میں حقیقت پسندی کا رویہ پنپ نہ سکتا تھا اس لیے انیسویں صدی میں ان کی کدوکاوش محدود بیانیے میں آگے بڑھی اور یوں استشراق میں سیکولر رجحانات فروغ پانے لگے جسے ماڈرن اور مینٹل ازم کہا گیا(۳۱):

"Linguists and explorers like Jones and Anquetil were contributors to modern orientalism, certainly, but what distinguishes modern Orientalism as a field, a group of ideas,a discourse, is the work of later generation than theirs. If we use the Napoleonic modern Orientalism, we can consider its inaugural heroes-in Islamic studies, Sacy and Renan and Lane to be builders of the field, creators of a tradition, progenitors of the Orientalist brotherhood."

انیسویں صدی،استشراق کا منہاج ہے۔ ایڈورڈ سعید اس ضمن میں دتاسی اور رینان کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ مؤخر الذّکر چونکہ براہِ راست اردو ادب متعلق سے نہیں اس لیے ہم دتاسی کو گفتگو کا حصہ بنائیں گے جنھوں نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر،اردو کے فروغ میں، اہم کردار ادا کیا اور نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ پیش پا محققین اور ادب کے جویاؤں کے لیے ایسے ضابطے مرتب کیے جنھیں سامنے رکھ کر، علمی و فکری امکانات کو، عملی جامہ پہنایا جاسکتا تھا۔ شعرا کے دواوین، اردو کی سال بہ سال بدلتی صورتحال اور یورپ میں اردو کو متعارف

کرانے میں اپنے عہد کی انتہائی اہم شخصیت جن کے تبحر اور کردار کی بابت، بد قسمتی سے، متصادم آرا ملتی ہیں۔ ایڈورڈ سعید ان کا نام احترام سے لیتے ہیں جبکہ قاضی عبدالودود اور مولوی عبدالحق صاحب کی رائے مختلف ہے۔ ذیل میں ان صاحبان کی آرا بالترتیب پیش کی جارہی ہیں(۳۲):

"His heroism as a scholar was to have dealt successfully with insurmountable difficulties; he acquired the means to present a field to his students where there was none. He made the books, the precepts, the examples.....The result was the production of material about the Orient, methods for studying it, and exempla that even Orientals did not have."

"دتاسی کی ذہنی صلاحیت محض معمولی ہے۔ اس نے جو اہم کام اپنے ذمّے لیا تھا اس کے لیے کافی تیاری نہیں کی اور جو مواد اس کے پاس جمع ہوا تھا وہ کام بھی نہ لے سکا جو ایک متوسط درجے کا محقق لے سکتا تھا۔۔۔۔یہ نہ سمجھا جائے کہ اُس زمانے میں فرانس کا معیارِ تحقیق پست تھا"(۳۳)

"وہ پکا عیسائی ہے اور عیسائی مبلغین کی کوششوں کو بڑے شوق سے بیان کرتا ہے اور عیسائی مذہب کی اشاعت کا متمنی ہے۔ تیسری بات جو وہ صاف صاف کہتا ہے یہ کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت باعثِ برکت و خیر ہے"(۳۴)

اور یہ صرف دتاسی کا ہی کہنا نہ تھا بلکہ کارل مارکس ایسے انسان دوست سے انگلستان کے ماہر سیاسیات بیل فورتک متعدد اہم علمی شخصیات کی آراء بھی کچھ اسی نوع کی تھیں۔ برطانوی امپیریل ازم، ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ گردانا گیا، اور متعدد حوالوں سے یہ باور کرایا گیا کہ اسی میں خطے اور اس میں بسنے والے کی نجات ہے کہ وہ جہالت کے اندھیروں سے باہر نکل رہے ہیں۔ ہندوستان کی سماجی تقلیب سے مصر کی تہذیبی تنقیح تک یہی راگ برابر الاپا گیا اور اس عذر کو بارہا پیش کیا گیا کہ مشرق، حالتِ تنزل میں ہے۔ یہ اپنی شاندار روایات سے منحرف ہو چکا ہے۔ اس کا بہترین دور، اب قصہ پارینہ ہے لہذا اسے اقوامِ عالم میں محکم بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مغرب اس کی مدد کو آئے اور اُس استحصالی نظام کا خاتمہ کرے جو قرنوں، زمانوں سے اِنھیں نسل در نسل برباد کر رہا ہے۔ یہ وہ دل پذیر استعماری کلیشے تھے جن کی بنیاد پر علاقے مفتوح کیے اور قومیں غلام بنائی گئیں۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء سے بعد کے اہم مستشرقین میں جان بیمز(JOHN BEAMS)،پالمر(PALMER)، ڈاکٹر ولیم ہوئی(HOEY)،ایوژنڈ ایونگ(EIVING)،ایچ بوخ مین(H. BOLCKMAN) سے جان پلیٹس (JOHN T. PLATTS)،کیپٹن بورادیل(CAPT. BORRADAILE) اور ڈبلیو ایل تھابرن(W.L.THOBURN) سے جی۔این۔رینکنگ(G.N.RANKING) اور ریورنڈ ہوپر(HOPPER) اور کریون(CRAVEN) کے نام ملتے ہیں(۳۵):

> "اس دور کے علمی سرمائے میں لسانی مطالعہ ہی اپنے عروج کو نہیں پہنچا بلکہ تدوینِ لغت میں جان پلیٹس کا نام بھی زندہ رہے گا جس نے اردو زبان کے مطالعے میں گرامر کی تدوین نو بھی کی اور لغت میں ان الفاظ پر زور دیا جن کی اصل سنسکرت یا پراکرت ہے"

اور گریرسن کا اصل کارنامہ لنگوئسٹک سروے آف انڈیا ہے۔اس عہد کی دیگر اہم شخصیات میں ہالرائیڈ اور لائٹنر کے نام خاص طور سے لیے جاسکتے ہیں جن کی کاوشوں کے ثمرات سے خطے کے لوگ آج بھی بہرہ مند ہیں۔انجمنِ پنجاب، گورنمنٹ کالج،اورینٹل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کا قیام ان ہی افراد کی جملہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کی مشرق پسندی کا یہ عالم تھا کہ ان کی بعض تحریریں ان کے قلمی نام مولوی عبدالرشید کے نام سے شائع ہوئیں۔انجمنِ پنجاب کی بابت بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور اس ضمن میں کرنل ہالرائیڈ کی مخلصانہ کاوشوں کے بارے میں موجود مواد کا ذخیرہ خاصا وقیع ہے۔

یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ انیسویں صدی استشراق کا زریں دور ہے،اور ہمارا تعارف بہت سی بے مثل،نابغہ عصر شخصیات سے ہوتا ہے۔یوں لگتا ہے کہ مشرق پسندی میں مسابقت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود تھا۔انتہائی زیرک اور جفاکش محقق،ماہرِ لسانیات اور ادب کے پارکھ اس منظرنامے میں ابھرتے ہیں اور اپنے پیچھے خاورشناسی کی ایک گہری لکیر چھوڑ جاتے ہیں۔یہاں ان تمام مستشرقین کا تعارف اور ان کے کارہائے نمایاں کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ ایک انتہائی مفصّل سلسلہ کلام ہے جس کے لیے ایک سے زائد ابواب کی ضرورت ہے۔اور پھر ان میں مختلف شعبوں کی تخصیص کے ساتھ ساتھ ان کے آبائی اوطان کی تفریق بھی ضروری ہے کہ بہت سے اہم مستشرقین جو یوں تو عہدِ برطانیہ میں سرکاری افسران کی حیثیت سے وارد ہوئے، لیکن ان کے آبائی اوطان جدا یا متفرق تھے مثلاً دہلی کالج کے الوئس اشپرینگر اور ڈاکٹر لائیٹنر دونوں انگریز نہیں تھے مگر برطانوی شہریت حاصل کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔دیگر اہم مستشرقین میں میجر اے آر فلر(FULLER)، سائمن

میتھیوایڈون کیمپسن(SIMON METHEW EDWIN KEMPSON)،جی۔ٹی ۔پلنکٹ (G.T.PLUNKETT)،ڈی۔سی۔فلاٹ اور گراہم بیلی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔من حیث المجموع اگر ان مستشرقین کی خدمات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہمیں یہ ماننے میں کچھ تامل نہ ہوگا(۳۶):

> " اردو زبان و ادب کی آبیاری میں مستشرقین نے جو حصہ لیاوہ اردو زبان و ادب کے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔اردو کی لسانی تاریخ،اردو لغت،اردو گرامر اور درسی کتابوں کی تدوین میں جو معیار ان فضلأنے قائم کیا،اس پر آج بھی بجاطور پر ناز کیاجاسکتاہے۔۔۔۔۔مستشرقین نے کلاسیکی کتابوں کی تدوین کا نیامعیار قائم کیا،اور زبان وادب کے معیاروں کو اس جانفشانی سے مرتّب کیاکہ آج کوئی لغت نویس،کوئی قواعد نویس،کوئی نقاد،کوئی تاریخ ادب کالکھنے والا،اِن غیر ملکیوں کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کرسکتا"

استشراق کا فکری کینوس پھیلتے پھیلتے بیسوی صدی کو جالیتاہے۔اس انتہائی بو قلموں عہد میں ، جہاں آرٹ ، کلچر، ادب، سیاست ، معیشت، سائنس، نفسیات اور فلسفہ و روحانیت کے مختلف شعبہ ہائے جات میں افکار و نظریات کا ایک سیلِ بے پناہ ٹھاٹھیں مارتاہے وہیں خاورشناسی میں بھی بہت سی اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ریاستی سطح پر پہلے سے توانا منصوبے کے تحت ڈسکورس، آگے بڑھانے کا قرینہ نظر آتاہے،اور یہ صدی بھی اپنے جلو میں بہت سی ایسی بہترین کاوشوں کو سمیٹے ہوئے ہے کہ اس عہد کو استشراق کے زریں دور سے،موسوم کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔اس پر بات کرنے سے قبل یہ دیکھنا مناسب ہے کہ استشراق کے تفاعل میں موجود فرق کس نوع کا تھا ، گواس بابت متعدد بیانیے موجود ہیں تاہم ایک اہم رائے کچھ یوں ہے(۳۷):

> "It became clear that institutions and governments were better at the game of management than individuals"..........What accompanies the shift is a change in the attitude as well of the individual Orientalists, who need no longer see himself-as Lane, Sacy, Renan, Caussin, Muller, and others did-as belonging to a sort of guild community with its own internal traditions and rituals. Now the Orientalists have become the representative man of his Western culture........"

یعنی انفرادی حیثیت میں جو تبدیلی آئی بات اس سے بڑھ کر اداروں اور حکومت تک جا پہنچی۔ اب اہمیت کے حامل افراد نہ رہے بلکہ وہ ادارے موقر کہلائے جن سے افراد وابستہ تھے۔ جزوی طور پر یہ کہنا درست ہے، لیکن من حیث المجموع صورتحال، یکسر تبدیل نہ ہو سکی، اور ہمیں بیسویں صدی میں بہت سی ایسی اہم اور بڑی شخصیات دیکھنے کو ملتی ہیں جن کے ہوتے ہوئے اداروں کا قد ناٹا محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر آنیماری شمل کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے۔ ان کا بیشتر کام، مذکورہ صدی میں، دادِ تحسین وصول کر چکا ہے، اور ان سے بھی پہلے، عالمی سطح پر متعدد ایسی شخصیات دکھائی دیتی ہیں جن کی انفرادی کاوشوں نے ایک عالم متحیر رکھا اور جن کا پھیلا ہوا تحقیقی کام، اوروں کے لیے، آج بھی مشعلِ راہ ہے(۳۸):

> "Therefore, in the best Orientalist work done during the interwar period–represented in the impressive careers of Massignon and Gibb himself– we will find elements in common with the best humanistic scholarship of the period."

میسی یوں کی انفرادی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس شخصیت نے شمل کی مانند اسلام اور مسلم روحانیت کا مطالعہ رومانی انداز پر کیا اور احتیاط کا دامن سلیقے سے پکڑا، اور پھر نہ صرف مطالعات پیش کیے بلکہ ایسے گرانقدر اضافے بھی کیے جو اوروں کے لیے کسی دریافت سے کم نہ تھے۔ میسی یوں کا اندازِ فکر ہمیشہ مثبت رہا۔ منصور حلاجؒ کی بابت جو مطالعہ پیش کیا وہ اس قدر جامع اور متاثر کن تھا کہ اقبالؔ تک کو اپنی رائے، مذکورہ شخصیت کی بابت تبدیل کرنا پڑی، اور جب شمل سے ملاقات ہوئی تو تصوف میں گلاب کے پھول کی سرّی اہمیت کچھ اس طرح سے بتاتے ہیں کہ موصوفہ بڑے احترام سے، اپنی آپ بیتی میں، اس کا تذکرہ کرتی ہیں۔ میسی یوں روحانیت کو ایک عملی تجربے سے کم نہ جانتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اُس وقت تک روحانیت کو سمجھا نہیں جا سکتا جب تک عملی طور پر اس کے مدارج طے نہ کیے جائیں۔ ایڈورڈ سعید کچھ ان الفاظ میں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں(۳۹):

> "Massignon was a tireless fighter on behalf of Muslim civilization and, as his numerous essays and letters after 1948 testify, in support of Palestinian refugees, in defense of Arab Mumslim and Christian rights in Palestine against Zionism..."

کچھ اسی نوع کا علمی اور عملی رویہ شمل کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ میسی یوں کی طرح شمل نے بھی اسلام اور اس کی سماجی اقدار کی بابت ایک ہمدردانہ رویہ قائم رکھا اور اس کے نتیجہ میں انھیں بھی سبّ و شتم کا ہدف بنایا گیا۔ غرض شمل سے قبل ایک بڑا نام جس نے مسلم معاشرت اور روحانیت کا بھرپور دفاع کیا وہ میسی یوں ہے۔

استشراق کے ضمن میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت دیکھنے میں آئی جب دوسری جنگِ عظیم کے آخری دورانیے میں برطانوی امپریل ازم دم توڑنے لگا اور اس کے ساتھ تباہ حال فرانس، ہالینڈ اور بیلجیم بھی عالمی تسلط سے دستبردار نظر آنے لگے؛ یہ جان چکے تھے کہ اب حالات ان کی گرفت سے نکل کر کسی اور نہج پر جا نکلے ہیں۔ عالمی افق پر ان کی حربی اور سیاسی عدم موجودگی سے امریکہ، تہذیبِ مغرب کو سہارتے، اپنے مذموم ارادوں کی تکمیل، کامیابی سے کرنے لگا، اور یوں استشراق کا ایک پھیلا ہوا فکری جغرافیہ، ایک عالمی طاقت کی فارن پالیسی کے تحت فروغ پانے لگا اور یہیں سے اس کے تنزل کا باقاعدہ آغاز ہوا، جب کم تربیت یافتہ اور خاور شناسی سے ناآشنا لوگ محض تعصب اور نفرت کی بنیاد پر، افکار و نظریات کی ترویج میں مشغول ہو گئے اور ریاستی ترجیحات میں دھونس اور دھاندلی کے عناصر فروغ پانے لگے تو ایسے میں پیش کردہ مطالعات غیر جانبدار نہ رہے اور ان کی بنیاد پر قائم ہونے والا نقطۂ نظر تعمیری نہ رہ سکا۔ غرض یہ امریکی استشراق جس کی مجموعی ساخت ہی جبری تسلط (HEGEMONY) پر قائم ہے اور جس کے لیے اپنے مفادات کا تحفظ ہر طرح کے انسانی وقار اور اقدار پر تفوق رکھتا ہے اور جو مقاصد کے حصول میں عسکری اور انتظامی بندوبست کا اہتمام کرتا ہے، کے ہاں استشراق کا بیانیہ، سیاسی اور معاشی حاشیوں میں مقید ہو کر رہ گیا۔ یہ نہیں کہ ماضی میں استشراق، سیاسی معیشت کا موئد نہ تھا یا ریاستی پھیلاؤ میں معاون نہ تھا، لیکن اب صورتحال متشدد ہو چکی تھی۔ علمی اور تحقیقی مطالعات پر پہلے سے طے سیاسی مقاصد کے غلبہ نے خود امریکہ میں موجود دانشوروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی ہی حکومت کے خلاف آواز اٹھانے پر مجبور کیا اور ریاستی عالمی جبر کے خلاف باقاعدہ قلمی اور عملی مزاحمت بھی کی۔ نوم چومسکی، ایڈورڈ سعید اور اقبال احمد، عالمی افق پر چمکتی ایسی روشن شخصیات ہیں جنھوں نے بساط بھر، امریکہ کے توسیع پسندانہ معاشی بندوبست کے خلاف احتجاج کیا اور یہ باور کرایا کہ اس کا یہ طرزِ عمل دائرہ انسانیت سے خارج ہے(۴۰):

> "Immediately after World War II, then, the Orient became, not a broad catholic issue as it had been for centuries in Europe, but an administrative one, a matter of policy. Enter the social scientist and

the new expert, on whose somewhat narrower shoulders was to fall the mantle of orientalism. In their turn, as we shall see, they made such changes in it that it became scarcely recognizable. In any event, the Orientalists took over the attitude of cultural hostility and kept them."

اس کے برعکس ایک بیانیہ اور جانچ کے لیے ملتا ہے جو استشراق کی بابت مجموعی طور پر ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ رکھتا ہے، اور اس سارے معاملے کو اکِ جدا نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے نزدیک استشراق، بے سبب اور تعصب کی بنیاد پر ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ مستشرقین کی بہترین اور مخلص کاوشوں کو بلا ضرورت مشکوک بنا کر پیش کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والی عظیم معاشی اور تہذیبی ترقی نظر انداز ہوئی۔ نہر سویز کی تعمیر کا معاملہ ہو یا غیر متمدن عرب اور ہندوستان کو مہذب بنانے کا جوکھم۔ اس ساری کدوکاوش کو صرف اس لیے مسترد کر دیا جائے کہ یہ صرف مغرب کی دین تھی اور اگر مغربی تہذیب برتر تھی تو اس پر ہاتھ ملنے یا تنفر برتنے سے حقائق تبدیل نہیں ہو سکتے۔ مشرق کو مغرب کے علمی و سائنسی تفضّل، حقیقت پسندی اور برتر انسانی معیارات کا احسان مند ہونا چاہیے اور جو سماجی و معاشی فیوض مغرب کی سرپرستی میں حاصل ہوئے انھیں برملا تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہی اعلیٰ ظرفی ہے؛ اپنی کجیوں، کوتاہیوں اور محرومیوں کا ذمہ دار، مغرب کو ٹھہرانا، کسی بھی طور مناسب نہیں(۴۱):

"The accuser in this trial, needless to say, is now the East itself, which from a passive object of history and study has revived as a subject, which seeks with profound travail its own soul and does not recognize it in its past or present in the mirror of European orientalistic investigation. Nor does it recognize the accuracy of the vision nor the honesty of the statements of this European and Western science, which for three centuries has been concerned with it. It tends precipitately to make of European orientalism a scapegoat for its own problems, anxieties and pains."

آخر میں ہم ان جرمن مستشرقین کی بابت گفتگو کریں گے جن کی جملہ کاوشیں ،اردو زبان وادب سے جڑی ہوئی ہیں۔ اقبالؔ نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں بہت سی اہم وغیر اہم شخصیات کا تعارف پیش کیا جو کسی نہ کسی حوالہ سے اردو اور فارسی زبان وادب سے وابستہ تھیں اور اقبالؔ جرمن استشراق کو باقاعدہ ایک تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں، گو اس بابت ان کی ذاتی رائے اس قدر حوصلہ افزا نہیں اور خود وہ بھی استشراق کے بارے میں شبہات کا اظہار کرتے ہیں البتہ جرمن استشراق کے بیشتر گوشے اِن کے لیے طمانیتِ قلب کا باعث ہیں اور خاص طور سے گوئٹے کے ذکر میں کسی قدر جذباتی نظر آتے ہیں(۴۲):

> "۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔۔۔۔یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا"

جیسا کہ پہلے اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ جرمن استشراق کی غایت، روحانی اور رومانوی لذت کا حصول تھا اور یہ یکسر طور پر برطانوی اور فرانسیسی استشراق سے جدا، اِک منہاج تھا کہ اس مطالعے اور کسبِ فیض میں معاشی بندوبست یا کسی الوہی مقصد کی تمامی کا اہتمام نہ تھا، اور وہ اس لیے بھی کہ مشرق میں جرمنی کی کوئی کولونی(COLONY) نہ تھی، اسی لیے اسے ایک بسیط اور کشادہ منظر کے طور پر دیکھا گیا۔ برطانیہ اور فرانس کی کولونائزیشن کے خلاف اور مشرق کی حقانیت یا سچائی کو ایک بلیغ استعارہ جان کر خاور شناسی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ یہ ایک نوع کی مغربی کلاسیکیت اور عیسائیت کے تسلیم شدہ آفاقی ضوابط کے خلاف ایک مزاحمت تھی یعنی مغرب جو ہر اعتبار سے، خود مکتفی ہونے کا داعی تھا یہ ایک طرح سے اُس کا بطلان تھا۔ اور جب لسانیاتی پردوں کے عقب میں تاک جھاک شروع ہوئی تو عقائد متزلزل ہو گئے اور یوں عیسائیت کا کائناتی رنگ ارنسٹ رینان اور یولیس ولہاسن نے گدلا دیا اور ان کا یہ ادّعا سامنے آیا کہ بائبل کی زبان الہامی نہیں۔ غرض لسانیات کو ایک انتہائی خطرناک شعبہ علم کے طور پر لیا گیا جسے جرمن اصلاحات کے نتیجہ میں، انیسویں صدی کے آغاز میں پذیرائی حاصل ہوئی اور ریاستی معاونت کے نتیجہ میں، تصورِ ریاستِ الٰہیہ کو بے دخل کیا گیا۔ جرمن استشراق کی ابتدائی صورت اور اس کے فکری تفاوت کی بابت سوزین مرچنڈ(SUZANNE MARCHAND) کی رائے اہمیت کی حامل ہے(۴۳):

"With Herder and Friedrich Schlegel, a kind of orientalist primitivism came into vogue; but this only survived by dint of being taken up into the new disciplines of Sanskrit philology and Semitic literature. Institutions fix norms and career paths, and the appointment of Sanskrit philolo- gists A. W. Schlegel and Franz Bopp at the universities of Bonn and Berlin in 1818 and 1821 set a lasting pattern. While English, French, and Dutch orientalists of this generation made the Orient a career by going there, as officials or travelers, German orientalists in this period made the Orient a career by becoming academics, and especially by becoming scholars of Sanskrit, Sumerian, and other safely dead orien- tal languages."

اور بات صرف یہیں تک نہیں رہتی بلکہ جرمن قیصر ولہلم دوم مشرق پسندی میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ اپنے زمانہ جلاوطنی میں، Leo Frobenius کو ۱۹۲۸ء میں لکھے ایک خط میں وہ اس شے کو تسلیم کرتے نظر آتے ہیں(۴۴):

"We are Orientals [Morgenldnder], and not westerners [Abendldnder]."

اقبالؔ نے جن دیگر افراد و شخصیات کو اختصار سے گفتگو کا حصہ بنایا ان میں ہرڈر، پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن سٹاٹ سے ڈومر، ہرمن سٹال، لوشکے اور فان شاک شامل ہیں۔ بوڈن سٹاٹک کی بابت ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں(۴۵):

"گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن سٹاٹ ہے جس نے اپنی نظموں کو مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ۱۴۰ دفعہ شائع ہوا۔ اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ دیر تک فارسی نظم کا ترجمہ تصور کرتے رہے"

ڈاکٹر آنیاری شمل نے اپنی کتاب GERMAN CONTRIBUTIONS TO THE STUDY OF PAKISTANI LINGUISTICS میں بہت سے اہم جرمن مستشرقین کا تعارف پیش کیا اور متعدد ایسے ادبی مغالطے جو شخصیات اور کتب کے حوالے سے اردو ادب کی تواریخ اور موضوعاتی کتب میں موجود ہیں کی بابت گرہ کشائی کی ہے، مثلاً جنوبی ہندوستان میں وارد ہونے والے جرمن مشنری بینجمن شوئی زا(BENJAMIN SCHULTZE) کی بابت گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ یوں تو ۱۷۹۶ء میں شائع ہونے والی ہندوستانی زبان کے حوالہ سے گل کرسٹ کی عملی گرائمر(Grammar of the Hindoostanee Language) کا ایک خاص شہرہ ہے تاہم اس سے بھی قبل جے۔فرگوسن نے رومن ہندسوں میں ہندوستانی زبان کی گرائمر، ڈکشنری آف ہندوستانی(DICTIONARY OF HINDOTANI) کے ابتدائیہ میں پیش کی، جو لندن سے ۱۷۷۳ء میں شائع ہوئی، اور شوئی زا کو گل کرسٹ اور فرگوسن پر زمانی تقدم کچھ اس طرح سے حاصل ہے کہ انھوں نے عہد نامہ جدید کا ترجمہ ۱۷۴۸ء میں مکمل کیا اور اردو گرائمر کے پہلے لکھاری کی حیثیت سے اپنی شناخت رقم کرائی۔ تمام یورپ کے مشنریوں کی آسانی کے لیے یہ گرائمر لاطینی زبان میں، ۱۷۴۸ء میں لیپزی(LEIPZIG) سے شائع ہوئی۔اس کی افادیت اور شوئی زا کو نظر انداز کرنے کی بابت ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے(۴۶):

> "Benjamin Schultze was almost forgotten by the scholars of Urdu; it was high time to revive his memory as the first successful writer on Urdu grammar. Schultze' pioneer work was finally published in its English text with an Urdu translation and copious notes in 1977 by the Board of Advancement of Literature, Lahore: A Grammar of Hindoostani Language, by Benjamino Schulzino, edited and translated by Dr. Abu Lais Siddiqi."

شوئی زا کے بعد جرمن استشراق کے ضمن میں یوں تو بہت سے افراد کے نام لیے جاسکتے ہیں تاہم گوئٹے اور ہرڈر، جن کا سرسری ذکر پہلے ہو چکا ہے کے بعد انتہائی اہمیت کی حامل شخصیت آلواشپرنگر (۱۸۹۳ء۔۱۸۱۳ء) کی ہے اور اگر اس کے کارہائے نمایاں کو جانچا جائے تو ولیم جونز کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ منفرد مستشرق ہیں، جن کے

ہاں مختلف النوع پیشہ ورانہ امور کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کئی اور طرح کے علمی وفکری مشاغل نظر آئیں گے۔غرض ان کی جملہ کاوشیں دیکھ کر ذہن کسی بھی طور یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ یہ فردِ واحد کی زندگی کے معمولات تھے؛دہلی کالج کی پرنسپل شپ، مخطوطات اور مسودات کی جانچ اور پھر اُن کی فہارس تیار کرنا، گرائمر کا لکھنا، چھاپے خانے کا اہتمام اور ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام(اس سے امکاناً سرسید احمد خان نے شہ پاکر غازی پور میں سائینٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا ہوگا)،اردو وفارسی کا مترجم اور فقہ اسلامی کا ممتحن ہونا،کلکتہ مدرسہ، محمڈن کالج ہوگلی کی سربراہی اور فورٹ ولیم کالج میں مشرقی زبانوں کی جانچ کے حوالہ سے ذمہ داریوں کو نبھانا، لکھنؤ لائبریری کا تفصیلی مطالعہ،۱۸۴۸ء سے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی سیکرٹری شپ، صحیح بخاری کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کتب کی فہارس(BIBLIOTHECA INDICA)،اودھ لائبریری کا کیٹلاگ اور سیرت نبوی ﷺ پر ان کی کتاب بعنوان Leben und Lehre des Muhammad برلن(۶۵۔۱۸۶۱ء) سے شائع کرانا(گو کہ اس کتاب میں ان سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی بابت فروگزاشتیں بھی ہوئیں) یہ سب جستجو وتفحص ایک مستشرق کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں؛اگرچہ ان کی جملہ مساعی،مالی منفعت کا چولا پہنے ہوئے تھی اوران کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کی والدہ آسڑیا(وی آنا) سے خط لکھتی ہیں تو بیٹے کا نام ALOY SPRENGER لکھ کر ایڈریس کی جگہ صرف ہندوستان لکھتی ہیں اور جب ڈاک کے ایک ذمہ دار نے نامکمل ایڈریس کی جانب توجہ مبذول کرائی تو جواباً ان کی والدہ نے کہا کہ ہندوستان میں میرے بیٹے کو ہر ایک جانتا ہے۔اردو خدمات کے ضمن میں ان کی کاوشوں کی بابت ذیل کے دو اقتباسات لائقِ توجہ ہیں(۴۷):

> "In the field of Urdu studies, Sprenger's catalogue of Oudh library is a masterpiece. Its importance is all the greater since barely any of the manuscripts survived the catastrophes of 1857, so that for quite a number of works his notes are the only available source. On pages 195-306, Sprenger gives an account of 1512 poets who wrote in Rekhta of Urdu, and his biographical account was considered so important by the historians of Urdu literature that it was translated into Udru by Maulana Tufail Ahmad in 1932 and

published in 1943 in Allahabad by the Hindustani Academy as Yadgar-i-Shu'ara".

"Among the nearly 2000 precious manuscripts which Sprenger sold to the Berlin Staatsbibliothek, there were 96 Hindustani manuscripts. It seems that greater part of them was lost during the war or the partition of Germany; the number of the Sprenger Urdu works in the Staasbibliothek Stiftung Preussischer Kulturbesitz in West Birlin in now 35, out of a total of 54 known Urdu manuscripts in all Western German libraries...".(۴۸)

انیسویں صدی ہی میں ایک اہم پیشرفت جرمن زبان میں ترجمہ کے حوالہ سے سامنے آئی۔ امانت لکھنوی کی 'اندر سبھا' پہلی بار مذکورہ زبان میں ترجمہ ہو کر دادِ سخن پاتی ہے۔ فریڈ غِش خوزن(FRIEDRICH ROSEN) کی پی۔ایچ ڈی کا یہ مقالہ بعنوانDie Indarsabha des Amanat ۱۸۹۱ء میں سامنے آتا ہے؛ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مقالے کے فوراًبعد ہیوبا جینسن(HUBERT JANSEN) امانت کی واسوخت پر کام کرتے ہیں اور اپنے ڈاکٹورل مقالے بعنوانZUR VERSKUNST DES URDU کو ۱۸۹۳ء میں پیش کرتے ہوئے اسے فریڈ غِش خوزن کے نام معنون کرتے ہیں۔ امانت کے اس ترجمے کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ جرمنی میں اسے منقلب (ADAPT) کر کے پہلی بار ۱۹۰۴ء میں اسٹیج کیا گیا۔ فریڈ غش خوزن کا تعارف شمل(۴۹) نے کچھ یوں پیش کیا:

"A young orientalist who had just joined the German Foreign Service. Born on August 30, 1856 in Leipzig, he was the son of Georg Rosen (1820-1891).....in 1925 he (Friedrich Rosen) contributed an article entitled Die Literaturgeschichte des Urdu to a manual of history of Literature...Rosen begins his thesis by giving the reason for his choice of this topics: The modern Hindustani

theatre, particularly drama in the Urdu language, is a field on which no European investigator has ever set foot".

فریڈ غش خوزن معروف جرمن مستشرق اور سفارت کار گیاخوزن(GEORG ROSEN 1821۔1891) کے بیٹے تھے جنھوں نے مولانا روم کی مثنوی کا ایک حصہ کامیابی سے جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔

پاکستانی زبانوں کے حوالہ سے اہم نام ارنسٹ ٹرمپ (ERNEST TRUMPP 1828-1885) کا ہے جنھوں نے مقامی زبانوں کی بابت غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ بنیادی طور پر وہ ایک مشنری تھے اور الوہی مقصد لیے ہندوستان وارد ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس یقین دہانی کے ساتھ کہ ان کی جملہ تحقیقی، علمی کاوشوں کو شائع کیا جائے گا، انھوں نے بہت کم عرصہ میں مختلف زبانیں سیکھیں اور کچھ عرصہ لاہور (۱۸۷۱۔۱۸۷۰ء) میں بھی گرنتھ کا ترجمہ کرتے ہوئے گزارا(۵۰):

"Who was this man whose name is most important among German Philologists in the field of Pakistani linguistics, and who has been called with full right by his successor on the chair in Munich University, Friedrich Homme, " the true founder of neo-Indian philology"....His accuracy and great talent for grammatical problems attracted the attention of the church mission society. This institution asked him to go to India for an intense study of modern languages and to compose their grammars and dictionaries for use by future missionaries....In the summer of 1854, Trump left for India".

۱۸۹۳ء میں آ۔سائیڈل(A. SEIDEL) نے اردو گرائمر کو پیش کیا جو اگرچہ انتہائی مختصر تھی تاہم اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے اگلے ہی برس شوئی زا کی گرائمر بعنوان GRAMMATIK DEC HINDUSTANISCHEN SPRACHE لیپ زی(Leipzig) سے شائع ہوئی جو بقول شمل، نایاب ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایک اور اہم گرائمر کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی جو بد قسمتی دوسری جنگِ عظیم کے

اختتامی سال میں شائع ہوئی اور اسی ہنگام میں گم ہو کر رہ گئی۔ اوشپیز(O.SPIES) کی اس گرائمر کی بابت شمل (۵۱)کی رائے کچھ یوں ہے:

> "During World War II the interest in Hindustani grew in Germany for political reasons, and the study of this language was practiced in some special military units. It was utterly bad luck that the first larger German grammar of Urdu was published at a time when next to nobody took notice of this new venture: O. Speis- E. Bannerth, Lehrbuch der Hindustani-Sprache, appeared in Leipzig 1945, at the very end of World War II. This is one reason why this grammar is almost unknown".

امراؤ جان ادا کا ترجمہ ۱۹۷۱ء میں سامنے آیا۔ اسے ارسلا غاستن ڈبز(URSULA ROTHEN-DUBS)نے پیش کیا اور افسانوں کی بابت ایک مجموعہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا، اس کے مرتب اٹالیاندا(ITALIAANDER)تھے۔

استشراق کے ضمن میں یہ اجمالی جائزہ جو ایک سے زائد بیانیوں کو محیط ہے بہت سے اہم مستشرقین کی بابت کسی قدر آگاہی فراہم کرتا ہے اور یقیناً اس شعبۂ علم کا دائرہ آج بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا انیسویں صدی میں متصور تھا۔ غرض اس محاظرہ میں ہم نے یہ کاوش کی کہ تحریک استشراق کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے مع، اس کی غرض و غایت اور آغاز کے حوالہ سے مختلف افکار پیش کیے جائیں۔ تاہم تحقیق کا سفر کبھی مکمل نہیں ہوتا؛ تشنگی اور عدم تکمیل ہمیشہ اس کا خاصا رہی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔علی رضا نقوی، سید، ڈاکٹر(۲۰۱۱ء) فرهنگِ جامع، فارسی بہ انگلیسی واردو اسلام آباد:مرکزِ تحقیقاتِ ایران وپاکستان، اشاعتِ سوم، ص

۲۔محمد کرم شاہ، الازہری، پیر(۲۰۱۳ء)ضیأ النبیﷺ(جلد ششم)لاہور:ضیأالقرآن پبلی کیشنز، ص۱۲۰

3۔Mikula Maja. Key concepts in cultural studies. England: Palgrave macmillan, p.144.Print

4۔http://www.odsg.org/Said_Edward(1977)_Orientalism.pdf p.19

۵۔محمد کرم شاہ، الازہری(۲۰۱۳ء)، پیر۔ضیأ النبیﷺ(جلد ششم)ص۱۱۹

۶۔عبدالقادر جیلانی، ڈاکٹر(۲۰۱۰ء) اسلام، پیغمبرِ اسلامؐ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر، لاہور، کتاب سرائے، ص۲۰

۷۔قرۃالعین حیدر، آخرِ شب کے ہمسفر، لاہور، چودھری اکیڈمی، س۔ن، ص۵۲

۸۔تبسم کاشمیری، ڈاکٹر(۲۰۰۹ء)اردو ادب کی تاریخ، ابتدأ سے ۱۸۵۷ء تک، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص۴۸۷

9۔ Said, Edward W. Orientalism.(1995)Harmondsworth: Penguin. P.74. Print

10۔ http://www.odsg.org/Orientalism.pdf.p.56

11۔ Said, Edward W. Orientalism.p.289

12۔ Macfie, A L. (2000) Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, P.58. Print

13۔ http://www.odsg.org/Orientalism.pdf.p.49,50

۱۴۔عبدالقادر جیلانی، ڈاکٹر، اسلام، پیغمبرِ اسلامؐ اور مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر، ص۱۷۰

۱۵۔ایضاً۔ص۲۱

۱۶۔ محمد ثناءاللہ ندوی،ڈاکٹر،مترجم وملخص(۲۰۰۹ء)،علومِ اسلامیہ اور مستشرقین،لاہور،نشریات،ص ۷۷

17۔ Said, Edward W. Orientalism.p.95

18۔ Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. Lincoln: University of Nebraska Press, 2008.p.10. Print

۱۹۔ناصر عباس نیر(۲۰۱۳ء)،مابعدِ نو آبادیات، اردو کے تناظر میں،کراچی،اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس،ص۱۰۱

۲۰۔ایضاً۔ص۱۱۰۔۱۰۹

21۔ Said, Edward W. Orientalism.p.75

22۔ Macfie, A L. Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, 2000. Print. p.34

23۔ Ibid.p.32

24۔ ibid.p.5

25۔ Said, Edward W. Orientalism.p.51

26۔ Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. p.10

۲۷۔رضیہ نور محمد،ڈاکٹر(۱۹۸۵ء)،اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،لاہور،مکتبۂ خیابانِ ادب،ص۱۴۹۔۱۴۸

۲۸: ناصر عباس نیر،(۲۰۱۳ء)، مابعدِ نو آبادیات، اردو کے تناظر میں،کراچی، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس،ص۱۲۰

۲۹۔رضیہ نور محمد،ڈاکٹر،اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۱۴۹

30۔ Said, Edward W. Orientalism.p.99

31۔ Ibid. 122

32۔ Ibid. 127

۳۳۔رضیہ نور محمد ، ڈاکٹر، اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،ص۱۶۶

۳۴۔ایضاً۔ص۱۶۸

۳۵۔ایضاً۔ص۲۶۰

۳۶۔ایضاً۔ص۲۹۳

37۔ Said, Edward W.Orientalism.p.246

38۔ Ibid.p.258

39۔ Ibid.p.270

40۔ Ibid.p.290

41۔ Macfie, A L. Orientalism: A Reader. p.81

۴۲۔احمد جاوید(۱۹۹۲ء)،تسہیل و فرہنگ، پیامِ مشرق(علامہ محمد اقبال)،لاہور، اقبال اکادمی پاکستان،دیباچہ(ح)

43۔ Marchand, Suzanne. "German Orientalism and the Decline of the West." Proceedings of the American Philosophical Society. 145.4 (2001): P. 470. Print

44۔ Ibid.p. 472

۴۵۔احمد جاوید(۱۹۹۲ء)،تسہیل و فرہنگ، پیامِ مشرق(علامہ محمد اقبال)،لاہور، اقبال اکادمی پاکستان،دیباچہ(ی)

46۔ Schimmel, Annemarie. German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics. Hamburg, 1981.P.47. Print

47۔ Ibid.p.64

48۔ Ibid.p.65

49۔ Ibid.p.74, 75, 77

50۔ Ibid.p.84, 87

51۔ Ibid.p.81, 82

❖ References:

1. Ali Raza Naqvi, Sayd, (2011), Frang-e-Jamia, Farsi bh Englisi o Urdu, Islamabad, Marqaz-e-Tahqeeqat-e-Iran o Pakistan

2. Muhammad kram Shah, Alzahri Peer, (2013), Zia ul Nabbi, Lahore, Zia ul Quran Publications, P 120

3:Mikula Maja. Key concepts in cultural studies. England: Palgrave macmillan, p.144.Print

4: http://www.odsg.org/Said_Edward(1977)_Orientalism.pdf p.19

5. Muhammad kram Shah, Alzahri Peer, (2013), Zia ul Nabbi, Lahore, Zia ul Quran Publications, P 119

6. Abdulqader Jeelani, (2010),Ialam: Pegambar-e-Islam aur Mustashrqeen-e-Magrib ka Andaz-e-Fiqar, Lahore, Kitab Saraye, P 20

7.Qura-tul-Aen Hedar,Akhar-e-Shab key Humsafar, Lahore, Chudarei Academy, P52

8. Tabasum, Kashmiri, (2009), Urdu Adab ki Kareekh,Ibtda se 1857 Tak, Lahore, Sang-e-Meel Publications, P 487

9: Said, Edward W. Orientalism.(1995)Harmondsworth: Penguin. P.74. Print

10: http://www.odsg.org/Orientalism.pdf.p.56

11: Said, Edward W. Orientalism.p.289

12: Macfie, A L. (2000) Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, P.58. Print

13: http://www.odsg.org/Orientalism.pdf.p.49,50

14. Abdulqadar, Jeelani, (2010), Ialam: Pegambar-e-Islam aur Mustashrqeen-e-Magrib ka Andaz-e-Fiqar, Lahore, Kitab Saraye, P 170

15. Abdulqadar, Jeelani, (2010), Ialam: Pegambar-e-Islam aur Mustashrqeen-e-Magrib ka Andaz-e-Fiqar, Lahore, Kitab Saraye, P 21

16. Muhammad Sanaullah, Nadwi, Dr, (2009), Alom-e-Islamia aur Mustashrqeen, Lahore, Nashriyat, P 77

17: Said, Edward W. Orientalism.p.95

18: Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. Lincoln: University of Nebraska Press, 2008.p.10. Print

19. Nasir Abass Neyar, (2013), Maabad Noabadiyat: Urdu key Tunazar Main, Karachi, Oxford University Press, P 101

20. Nasir Abass Neyar, (2013), Maabad Noabadiyat: Urdu key Tunazar Main, Karachi, Oxford University Press, P 109,110

21: Said, Edward W. Orientalism.p.75

22: Macfie, A L. Orientalism: A Reader. Edinburgh: Edinburgh University Press, 2000. Print. p.34

23: Ibid.p.32

24: ibid.p.5

25: Said, Edward W. Orientalism.p.51

26: Burke, Edmund, and David Prochaska. Genealogies of Orientalism: History, Theory, Politics. p.10

27. Razia Noor Muhammad, Dr, (1985), Urdu Zaban aur Adab Main Mustashrqeen ki Elmi Khedmaat ka Tahqeeqi o Tanqedi Jaiza, Lahore, Maktba Khyaban-e-Adab, P 148, 149

28. Nasir Abass Neyar, (2013), Maabad Noabadiyat: Urdu key Tunazar Main, Karachi, Oxford University Press, P 120

29. Razia Noor Muhammad, Dr, (1985), Urdu Zaban aur Adab Main Mustashrqeen ki Elmi Khedmaat ka Tahqeeqi o Tanqedi Jaiza, Lahore, Maktba Khyaban-e-Adab, P 149

30: Said, Edward W. Orientalism.p.99

31: Ibid. 122

32: Ibid. 127

33. Razia Noor Muhammad, Dr, (1985), Urdu Zaban aur Adab Main Mustashrqeen ki Elmi Khedmaat ka Tahqeeqi o Tanqedi Jaiza, Lahore, Maktba Khyaban-e-Adab, P 166

34. Ibid, P 168

35.Ibid, P 260

36.Ibid, P 293

37. Said, Edward W. Orientalism.p.246

38. Ibid.p.258

39. Ibid.p.270

40. Ibid.p.290

41. Macfie, A L. Orientalism: A Reader. p.81

42. Ahmad Jawed, (1992) Tahseel o Farang, Peyam-e-Mashrik, Alama Iqbal, Lahore, Iqbal Acedmy, Debach (H)

43: Marchand, Suzanne. "German Orientalism and the Decline of the West." Proceedings of the American Philosophical Society. 145.4 (2001): P. 470. Print

44: Ibid.p. 472

45. Ahmad Jawed, (1992) Tahseel o Farang, Peyam-e-Mashrik, Alama Iqbal, Lahore, Iqbal Acedmy, Debach (y)

46. Schimmel, Annemarie. German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics. Hamburg, 1981.P.47. Print

47. Ibid.p.64

48. Ibid.p.65

49. Ibid.p.74, 75, 77

50. Ibid.p.84, 87

51. Ibid.p.81, 82